علی گڑھ ڈائسپورہ - ۲۲

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدسالہ جشن کے فِنالے (دسمبر ۲۰۲۱) کی تقریب سے شروعات

احمد ندیم قاسمی کی ایک تاریخ ساز کہانی

پرمیشر سنگھ

عہدِ درندگی میں، ہندستانی انسانیت کی عظیم ترین کہانی : اس سے برتر کہانی صرف احمد ندیم لکھ سکتا تھا

عہدِ درندگی میں ، اردو انسانیت کی عظیم ترین کہانی: اس سے برتر کہانی صرف احمد ندیم لکھ سکتا تھا! یہ ہندوستان کے بٹوارے کی ایک دکھ بھری کہانی ہے جب ماں کے دو ٹکڑے ہوئے تھے، اور کتنی ہی ماؤں کے دلوں کے ٹکڑے اِدھر سے اُدھر جا گرے تھے، اور اُدھر سے اِدھر۔جب انسان جانور بن گیا تھا، بلکہ درندہ جانور۔ نہ سِکھ ، سِکھ رہا تھا نہ مسلمان، مسلمان۔ دونوں طرف جنگل راج تھا اور درندے بے روک ٹوک دندناتے مارتے کاٹتے پھر رہے تھے۔ ایسے میں جابجا انسان جاگ اٹھتا تھا۔اور وہ کبھی رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مر گیا" میں زندہ ہو جاتا، کبھی کرشن چندر کی کہانیوں "ہم وحشی ہیں" میں، کبھی منٹوکے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں ، توکبھی ندیم کے پرمیشر سنگھ میں۔ یہ تاریخ، ہندوستان کی خونیں تاریخ ، جب ہمارے بونے لیڈروں نے انگریز سامراجیوں کے ساتھ ملکر ہمارے وطن کے دو (بلکہ تین) ٹکڑے کر دئیے، ایسے کہ آج تک زخموں سے خون رِس رہا ہے،درندگی کی اس بھیانک تاریخ کے اُس لمحے کو جب انسان جاگ اٹھا تھا، ایک اور شریف انسان، ایک شریف ادیب نے کس پیار سے اور کس درد سے اپنی کہانی میں محفوظ کر لیا ہے، اس کے لئے یادگار بن گئی ہے یہ تاریخ ساز کہانی .

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا کہ جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے، ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ ”کہیں آ ہی رہا ہوگا“۔ کسی نے کہہ دیا۔ ”ہزاروں کا تو قافلہ ہے“۔ اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ ”آ ہی رہا ہوگا“۔ وہ سوچتی۔ ”کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا۔ اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر-- پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھ دار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے، آ جائیگا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔“

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل ادھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال وہ روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا۔ ”میں نعرہ تکبیر مار دوں گا“۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا۔ ”ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورجی نے پیدا کیا ہے، جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا“۔

”مارو نہیں یارو“۔ پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ ”اسے مارو نہیں۔ اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگوروجی نے پیدا کیا ہے۔ جس نے۔۔۔“

”پوچھ لیتے ہیں اسی سے“۔ ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔ ”بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ خدا نے کہ واہگوروجی نے؟“

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے، منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ ”پتہ نہیں“۔

”لو اور سنو“ کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔ ”اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا“۔

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ ”سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا“۔

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پُھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا ”لے پرمیشرے، سنبھال لے۔ کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے، لے پکڑ“۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی، اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں، اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر اکچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنہوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا، اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپک کا ساتھ دیتے رہے، دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے، پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''اختر'' اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

''اختر بیٹے''۔ پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو!''

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ ''آہا!'' اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ ''تتلی!''

''لو گے؟'' پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

''ہاں!'' اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملایا۔

''لو'' پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی۔ اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا ''سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یوں ہی منہ لٹکا لیتا تھا''۔

''پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے'' نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا، اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

''پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا۔ ''ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس جائیں گے''۔ پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے یہ کہا کہ ''ہاں ہاں بیٹے، تمہیں تمہاری اماں پاس ہی لئے چلتا ہوں۔'' تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چاردیواری میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ اور وہ بڑی پر اسرار سرگوشی میں بولا تھا ''یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!''۔

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔ ''جانے کیا ہو گیا ہے اسے!'' اس نے کہا تھا۔ ''واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب سے کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھولی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا۔ کہتا تھا۔ ''بیٹی کو برا مت کہو، بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بیچاری، ہمارے گھروندے میں ستانے بیٹھ گئی ہے، وقت آئے گا تو چلی جائے گی۔ اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اُٹھ جاتے ہیں۔''

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا، اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا ''سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!''۔ بیوی اسے محض ''اونہہ'' سے ٹال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں مین انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا۔ اور جب صبح اذان ہوتی ہوتی تھی تو کیسا مزہ آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا، جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اُجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ موذن کے آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔

یونہی کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے وہ سو جاتی، اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔ ''ٹھیک ہے سوئے نہیں تو اور کیا کرے، بگّی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔''

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی۔ ''یہ کون ہے؟''

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ڈرو نہیں بے وقوف، اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں، یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے اس کا نام اختر ہے۔''

''اختر!'' بیوی کے تیور بدل گئے۔

تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا''۔ پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔

''اور پھر کیسوں کا کیا ہے۔ دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا''۔

''پر یہ ہے کس کا؟'' بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

''کس کا ہے!'' پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''واہگورو جی کا ہے ہمارا اپنا ہے۔ اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی دیکھ نہیں سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے، یہ کرتارے ہی کا تل ہے کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے۔ اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں، تو یارو، یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں۔ اور......''

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا، بلبلا اٹھا۔ ''ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم ا ماں کے پاس جائیں گے۔ اماں پاس۔''

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ ''اری لو۔ یہ امّاں پاس جانا چاہتا ہے''۔

''تو جائے''۔ بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا تھا جسے پرمیشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ ''ڈاکہ ڈالنے گیا تھا سورما، اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا۔ اور پھر، پگلے، تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مسلّا ہے؟ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔''

پرمیشر سنگھ نے التجا کی۔ ''کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے۔ سمجھیں؟''

''نہیں'' اب کے بیوی چیخ اٹھی۔ ''میں نہیں سمجھی، نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کر پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے۔ لے جا اسے پھینک دے باہر''۔

''تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟'' اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔

''تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟''۔ وہ بیوی کی طرف بڑھا۔ اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آگئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو دہلا دیا۔ ''اختر کدھر گیا؟'' وہ چنگھاڑا۔ ''ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو، اختر۔ اختر!'' چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے، عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں۔ اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ ''ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو، ارے وہ گیا کہاں۔ ''اختر۔ اے اختر۔''

''میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔'' پگڈنڈی کے ایک موڑ پر، گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ ''تم تو سکھ ہو''۔

''ہاں بیٹے سکھ تو ہوں'' پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔

''تو پھر ہم نہیں آئیں گے''۔ اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

''نہیں آؤ گے؟'' پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

''نہیں''۔

''نہیں آؤ گے؟''

''نہیں نہیں۔ نہیں''۔

''کیسے نہیں آؤ گے؟'' پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا، اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ ''چلو''۔ وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے۔ پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ ''نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا''۔

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی رونی آواز میں بولا۔ ''مجھے معاف کر دے اختر، مجھے تمہارے خدا کی قسم۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا، پھر تمہاری ماں پاکستان سے آکر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سن رہے ہو نا؟ پھر وہاں سے اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا، کرتارا نام کا، تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا۔ اچھا؟

''اچھا!'' اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے! ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ ''روتے کیوں ہو پرمیشرے، کُل ایک مہینے کی تو بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا''۔

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ ''تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو۔ اور اگر ادھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا''۔ پھر اس کی آواز میں گرج آگئی ''یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، خالصہ ہوں۔ سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں''۔

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتو کھ سنگھ اندر آیا۔ اور بولا۔ ''پرمیشر سنگھ!''

''جی''۔ پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

''دیکھو''۔ گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ ''کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا' اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھوگئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟''

''جی!'' پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں'' گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

''ایسا ہی ہو گا گرنتھی جی''۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ ''پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے، لگتا ہے پہلے جنم میں مسلا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشر نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا اس چھوکرے کو چاٹے، موا نکما۔ واہ گورو جی کا بھی لحاظ نہیں''۔

''واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی۔'' پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیر لب گالیاں دیتا رہا، کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آگیا۔ ''اچھا جی۔ اچھا''۔ اس نے کہا۔ اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لووں تک کس کے بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا، اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آکر پگڑی اتارتا تھا، تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ ''ذرا ادھر تو آ امر کورے! یہ دیکھ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ''۔

''نہیں ماں'' امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ ''جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھی صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے، اسی طرح کرتارا بھی ایک ہی ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔ ''اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا''۔

''میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتارا ہے، میرا چاند سا لاڈلا بچہ!'' پرمیشر سنگھ کی بیوی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں۔ ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتار کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی اماں کے لئے روتا رہا، اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچائت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا، اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا میرے سر پر پگڑی باندھو پرموں۔ میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔''

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ ''یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک

بات نہیں ہوگی۔ وہ بات کبھی نہیں ہوگی ،وہ نہیں ہوگا مجھ سے، سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے“۔

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھمو کا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بھپر گیا،۔ اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار سے گلی میں پٹخ دیتا۔ ”الو کی پٹھی“ اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ ”سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اُٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی، اور اُٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا، جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو۔“ اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند ہوگئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ ”پانی۔“ اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں ادھر اُدھر دیکھا اور ”پانی“ کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اُٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ ”پانی دے!“ اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھویں سیکڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا۔ ”پانی دیتی ہے   کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ میں ماروں گا“۔ امر کور نے اب کے اس کے طرف دیکھا ہی نہیں بولی ”مار تو سہی۔ تو کرتارا تو نہیں کہ میں تیری مار سہ لوں گی، میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔“ اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنا لی تھی اور وہ سسک سلک کر کہہ رہا تھا۔ ”ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس چلیں گے۔“ پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ ”کیوں پانی پلاؤں، کرتارا بھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر، ہاں!“

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے۔“

”نہیں“ اختر بڑے غصے سے بولا۔ ”یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کہ پانی پلاتی ہے۔“

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا۔ ”تمہارے ہاتھ سے نہیں پیئیں گے۔ تم تو امر کور سور کی بچی کی اماں ہو، ہم تو پرمو کے ہاتھ سے پیئیں گے۔“

”یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے!“ امر کور نے جل کر کہا۔

”تو ہوا کرے! اختر بولا۔ ”تمہیں اس سے کیا۔“

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا ،اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کو بخار اُتر چکا تھا، اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ   سے بولا۔ ”اری سنتی ہو،“ ”سن رہی ہوں؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے“۔

بیوی نے پہلے تو اسے پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی۔ ”بیٹی۔“

”کیا ہے ماں“۔ امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ ”سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔“

یہ ایک ثانیئے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ ”ڈر گئے بیٹا؟“

”ہاں“ اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ ”کوئی چیز چیخی تھی“۔

امر کور چیخی تھی۔“ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ”ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے“۔

”میں پڑھ رہا تھا!“ اختر بولا

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائیگا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی ”میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔“

”کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟“ پرمیشر سنگھ نے پوچھا

”پڑھوں؟“ اختر نے پوچھا

”ہاں ہاں۔“ پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اسنے اپنے گریبان میں چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں“

”ہاں ہاں“ پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا۔ اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا۔ ”کیا نیند نہیں آتی تھی؟“

”ہاں!“ اختر بولا۔ ”اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے۔ نیند نہ آئے تو تین بار قل ھو اللہ پڑھو نیند آ جائے گی۔ اب آ رہی تھی، پر امر کور نے ڈرا دیا۔“

”پھر سے پڑھ کر سو جاؤ“ پرمیشر سنگھ نے کہا۔ ”روز پڑھا کرو، اونچے اونچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔“ اس نے اختر کو لٹا اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کو ر پکاری ”نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے؟“

”ڈر لگتا ہے؟“ پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کس سے ڈر لگتا ہے؟“

”جلتا رہے۔ کیا ہے؟“ بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ ”پگلیاں۔“ وہ بولا۔ ”گدھیاں۔“

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں ”پڑوس“ کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی

شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے۔ اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا، اور قل ہواللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔"

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں"

"کرتارا؟"

"نہیں"۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں ہاں وہی، کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہوگئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے، مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے، پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی طرف سے چھوٹا تو بولا۔ "کیوں بے کرتارو تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا۔" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مسلا۔" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا؟" اختر نے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ "سنو بیٹے۔ میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا۔ "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا۔" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کئے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا۔ "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ، جب یہ چلے جائیں گے نا، تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا، مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا۔ "فوجیوں کی لاری آ گئی" وہ مینڈھ پر سے کود پڑا، اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔

"گیانے او گیان سنگھ!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا، اسے کوئی بات سمجھائی، پھر دونوں اختر کی طرف آئے، گیان سنگھ نے نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا۔ "آؤ بھئی کرتارے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو، جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔ ہونہہ!" -- پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی۔ "جاؤں؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا، پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے ادھر اُدھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے اُدھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے، پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس مامتا پر بڑا زور دیا جوان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیا لی گئیں تھیں۔ "اور مذہب کا کیا ہے دوستو۔" اس نے کہا تھا۔ "دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بنانا سکھاتا ہے۔ اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں ہم رسول کے غلام ہیں" تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا۔ اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارک باد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارک بادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا، اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا الگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔

"ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلایا۔ اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری۔ "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "سنو۔ کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے۔"

"لو اور سنو۔" بیوی بولی۔ اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔

"کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے۔"

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اُٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کو کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا۔ "آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آ کر وہ بولا۔ "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے، یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا، یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمہاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر بولا۔ "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟"

"ہاں" پریمشر سنگھ کی آواز مین گونج تھی۔ "چلو گے اماں کے پاس؟"

"ہاں" اختر بولا۔ "پر تم لے تو جاتے نہیں، تم بہت بُرے ہو۔ تم سکھ ہو۔"

پریمشر سنگھ بولا۔ "نہیں بیٹے، آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اداس ہوں۔"

"میں بھی تو اداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔

"میں تمہیں تمہاری اماں ہی کے پاس لے جارہا ہوں۔"

"سچ؟" اختر پریمشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ "ہم اماں پاس جارہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔"

پریمشر سنگھ چپ چاپ روئے جارہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کرکے اس نے اختر سے پوچھا۔ گانا سنو گے؟"

"ہاں"

"پہلے تم قرآن سناؤ۔"

"اچھا۔" اور اختر قل ھواللہ پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھوکی اور بولا۔ "لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کردوں۔"

رُک کر پریمشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھوکردی اور بولا۔ "اب تم سناؤ۔"

پریمشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھالیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا، اس لئے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بتو دا سر بن در گا جے
بتو دا منہ چن در گا جے
بتو دا لک چترا جے
لوکو بتو دا لک چترا

"بتو کون ہے؟" اختر نے پریمشر سنگھ کو ٹوکا۔

پریمشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا وقفے کے بعد بولا۔ "میری بیوی ہے نا، امر کور کی ماں، اسکا نام بھی تو بتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بتو ہوگا"۔

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا۔ "وہ کوئی سکھ ہے!"

پریمشر سنگھ خاموش ہوگیا۔

چاند بہت بلند ہوگیا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پریمشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پریمشر سنگھ سے پوچھا۔ "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پریمشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آگئی، یہ گرو گوبند کی کہانی تھی۔ لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا۔ اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا۔ "ارے چاند تو سر پر آگیا!"

پریمشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا، پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا۔ اور بولا۔ "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا۔"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا، جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پریمشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "جاؤ بیٹے۔ تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں۔۔"

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اور سرگوشی میں بولا۔ "اذان کے وقت نہیں بولتے"۔

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پریمشر سنگھ بولا۔

"شش!" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پریمشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا، اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا۔ اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم......"

"کیوں؟ کیوں نہیں آؤ گے؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے"۔ پریمشر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔ "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا، کرتارا نہیں۔ اختر! پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا۔ اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا"۔

"لکھوں گا"۔ اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمہیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے تو اسے ادھر بھیج دینا۔ اچھا؟"

"اچھا"۔

پریمشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔ "جاؤ"۔

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔ "تم بھی آجاؤ نا"۔

"نہیں بھئی۔" پریمشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔ "تمہاری امان نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پریمشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا۔" بات اختر کی سمجھ یں آگئی اور قل ھواللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم پو اُفق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جارہا تھا۔ پریمشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا۔ اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے "کون ہو تم؟"

"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا۔ میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں ماردوں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھپ سے گرے، اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ "ہالٹ!" ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پریمشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا۔ مگر خون اس کی پگڑی کے سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

دور اختر بھاگا آرہا تھا۔ اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

☆☆☆

علیگ عزیزوں کے خط
From Alig Brotherhood

حسب روایت ’’علیگڑھ ڈائسپورا کا بیسواں شمارہ‘‘ ہمہ گیری کا آئینہ دار ہے۔ درحقیقت ہندوستان، اردو اور ہندی زبانیں ’’یک جان و سہ قالب کی مانند ہیں‘‘۔ یہ گنگا جمنی تہذیب کے ماتھے پر ایک طلائی اور نقرئی جھومر کی طرح ہیں کہ جن کی آب و تاب اب دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ اِس دفعہ آپ نے اپنے قلم کی جولانی کو بروئے کار لاتے ہوئے ’’برادرانِ حکمت‘‘ کے تقابل کو انصاف کے ترازو میں خوب تولا ہے۔ بحیثیت صحافی، حکیم محمد سعید صاحب کی جدوجہد کو مجھے بھی بہت قریب سے دیکھنے اور اُس کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا اور دونوں بھائیوں کے درمیان آپ کا موازناتی تجزیہ بالکل درست ہے۔ میں نے اُن کو بہت ہی مخلص، سچا اور دردمند انسان پایا اور وہ کسی حد تک اپنے نصب العین کو پانے میں کامیاب بھی ہوئے مگر جب کسی معاشرے میں بدطینتی، بدنفسی، بدمعاملگی اور تعصب اپنے پنجے گاڑ لیں تو پھر بڑی سے بڑی شخصیت بھی بے بس، لاچار اور محبوس نظر آتی ہے۔ مجھے ایک بار اُن کی آخری آرام گاہ پر فاتحہ کا موقع ملا اور وہاں میں نے حد درجہ سکون محسوس کیا تھا۔ کیونکہ ایک مظلوم، انتہائی مخلص اور دردمند انسان کا مرقد خدائے بزرگ و برتر کی بخشائش، درگذر اور رحمتوں کا عکاس ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اِس عارضی دنیا میں ہر بڑے آدمی کا یہی انجام ہوتا ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب قدیم وجدید تعلیم کے فروغ میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ جامعہ ہمدرد اُن کی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ سرسیّد علیہ الرحمہ، اُن کے جیّد رفقائے کار اور مادرِ درسگاہ علیگڑھ سے حکیم صاحب کا طویل اور دیرینہ تعلق جدید ہندوستان کا ایک روشن باب ہے۔ ترویج تعلیم کے ضمن میں جن زعمائ، فصحا اور فقہاء نے تاریک گوشوں کو علم و آگہی کی بنیادیں فراہم کیں اُن میں حکیم عبدالحمید صاحب سرِفہرست نظر آتے ہیں۔ اگر سرسیّد علیہ الرحمہ اس لافانی کہکشاں کے ’’شمس المعلمین‘‘ ہیں تو یہ تمام ہستیاں اُن چمکتے دمکتے ستاروں کی مانند ہیں کہ جن کے کارہائے نمایاں نسل در نسل ترقی اور عروج کی داستانیں رقم کریں گے۔ مجھے اور سلمیٰ کو دہلی میں سیّد حامد صاحب سے دو مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ہم نے اُن کی شخصیت کو مختلف النوع خصوصیات اور اُوصاف کا مجموعہ پایا۔ جب سلمیٰ علیگڑھ میں زیرِ تعلیم تھیں تو اُنھوں نے بحیثیت ایڈیٹر ’’عبداللہ ہال میگزین‘‘ سیّد صاحب کا انٹرویو ریکارڈ کیا تھا اور اُن کی عطا کی ہوئی تصنیف بمعہ تہنیتی کلمات ’’نگار خانہ رقصاں‘‘ آج بھی ہمارے کتب خانے کی زینت ہے۔

جب تک یہ دنیا قائم ہے اہلِ فکر و نظر سرسیّد علیہ الرحمہ کی وسیع العلم اور کثیر المعانی شخصیت کو ہمیشہ اپنی تحقیق اور تدبیق کا موضوع بناتے رہیں گے۔ دیکھا جائے تو سیّد بزرگ بہت بڑے درجے کے ماہر نفسیات بھی تھے۔ اُن کے حیرت انگیز اقدامات اور عمیق مگر دِل میں اُتر جانے والی تحاریر مشعلِ راہ اور مشعل جاوِید کی مانند ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی۔ بدقسمتی سے تنگ نظری، کم علمی اور تعصب نے ایک عرصہ سیّد بزرگ کے اِرد گرد ایک ہالہ ساحضر ورپیدا کر دیا تھا مگر پھر جب اُن کی تحریک کو لوگوں نے جانچا، پرکھا اور سمجھا تو یہ سب لایعنی تہمتیں قصہ پارینہ بن گئیں۔ یہاں بہت اعلیٰ درجے کے افکار کو سمجھنے کے لئے ایک معیاری ذہن کا ہونا بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بدقسمتی سے مخالفین سرسیّد اور علیگڑھ میں یہ وصف تقریباً ناپید تھا۔ اِس کی سب سے عمدہ مثال قرونِ اولیٰ کے وہ مسلمان سائنسداں، فلسفی اور مفکرین ہیں جن سے بدترین سلوک روا رکھا گیا اور جن کے آخری ایام بڑے کرب اور کسمپرسی کے عالم میں گزرے۔ مگر یہ بات طے ہے کہ سرسیّد علیہ الرحمہ نے ’’اٹھارہ سو ستاون‘‘ کے بعد تاریک راہوں میں جو علم و آگہی کی شمع روشن کی تھی وہ اب ایک آفتاب کی مانند ہے اور جس کی کرنیں ہر جانب اپنا اثر دکھاتی نظر آتی ہیں۔

’’عظیم نثر کے عظیم نمونے‘‘ بقلم پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب خاصے کی شے ہیں۔ اُنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اور فخر و مباہات کا احساس ہوتا ہے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے مگر عام فہم اور پاکیزہ جملوں میں معنویت اور رہنمائی کی ایک دنیا سمٹ آئی ہے۔ یہ رشید صاحب کا حیرت انگیز مشاہدہ ہے جو عام لوگوں کے لئے غور و فکر کی دعوت ہے۔ شیام کرشن بھٹنا گر کے نام رشید صاحب کے خطوط کا آشکار ہونا یقیناً ڈاکٹر ذکیہ جیلانی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مزید برآں، کتاب دار کی ذمہ داری اور منیر فرشوری صاحب کی غزل قابل مطالعہ و ستائش ہیں۔

آپ کی تحریک ہم آہنگی اور یگانگت کی جانب ایک مستحسن قدم ہے۔ علی سردار جعفری صاحب کا پیغام دل پر ایک گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ کچھ عجیب سا معاملہ ہے اور ایک دوسرے سے ملنے کی آس میں نہ جانے کتنے لوگوں نے خاک کی چادر اوڑھ لی۔ نہ جانے یہ آسانیاں کب فراہم ہوں گی۔ دونوں جانب اجازت کا حصول ایک مشکل امر ہے۔ پھر لکھ رہا ہوں کہ ’’علیگڑھ برادرہڈ‘‘ ایک اچھا قدم ہے اور سب کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ میرے تحریریں شامل کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ اور آپ کے رفقائے کار حد درجہ تحسین و مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جو سلسلہ آپ نے 2021 میں شروع کیا تھا اب اُس میں وقت کے ساتھ ساتھ استحکام اور نکھار پیدا ہو رہا ہے۔

-شاہ عمر عطا

***

आज़ादी संग्राम पर-और-इन्सानियत
(जो हमेशा ज़िन्दा रहती है) पर
साहित्य जगत की सबसे बड़ी कहानी
प्रमेशर सिंह

Back to Humanism!
The biggest story writer's
Biggest story
Parmeshar Singh
on
The noble humanist
Available in Urdu & English

آزادی سنگرام پر۔اور۔انسانیت (جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے) پر
ساہتیہ جگت کی سب سے بڑی کہانی
پرمیشر سنگھ